

دین اسلام کی معاشرتی ترویج میں آرت کی اہمیت

معاشرے میں چھائی ہوئی ابتری کے پیش نظر ہمارے ہاں ایک جملے کی مقبولیت کا گراف مسلسل بلند ہوتا جا رہا ہے۔ وہ مقبول عام جملہ یہ ہے کہ ”لوگ بے دین ہو گئے ہیں“۔ حالانکہ یہ بات صریحاً غلط ہے، کیونکہ اصل بات یہ ہے کہ جس سوچ کو دین کا نام دیا جا رہا ہے، وہ دین نہیں ہے یا پھر زیادہ سے زیادہ وہ دین کی فقط ایک جہت ہے۔ اسی کی وجہ سے معاشرتی ابتری بڑھ رہی ہے نہ یہ کہ بے دینی اس کا سبب ہے۔

راقم کی نظر میں ہمارے محترم علماء جب بھی دین کی بات کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں حقیقتاً ”فقہ“ ہوتی ہے اور فقہ کی بھی جزئیات (۱) یہ ایک عظیم فروگزاشت ہے جو تسلسل سے ہو رہی ہے۔ اگر کسی صاحب کو اس بنیادی نکتے سے ہی اختلاف ہو جس پر اس مضمون کی پوری عمارت کھڑی ہے تو گزارش ہے کہ ذرا دینی مدارس کے نصاب اور اس نصاب کو پڑھانے کی ”اپروچ“ پر سرسری نظر ڈال لیں، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ فقہ کو دین کے متوازی کھڑا کرنے اور اسی کو دین قرار دینے سے معاشرتی بگاڑ آج جن جہتوں پر پنپ رہا ہے، وہ کسی وقت بھی ان امکانات کو چٹ کر سکتا ہے جو ٹھماتے چراغوں کی مانند اب بھی ہمارے باطن میں روشنیاں نکھیر رہے ہیں۔

ہمارے ہاں دین کی غلط تعبیر کی مانند عالم کی تعریف بھی غلط کی گئی ہے۔ آج جنہیں ’علماء‘ کہا جاتا ہے، وہ دراصل ’ماہرین فقہ‘ کہلائے جانے کے زیادہ مستحق ہیں (۲)۔ چونکہ ان ماہرین فقہ کو علماء گردانا جا رہا ہے، اس لیے اس حدیث مبارک ﷺ کے مطابق کہ ”علماء، انبیاء کے وارث ہیں“، ’ماہرین فقہ‘ کو ہی انبیاء کا وارث تسلیم کر لیا گیا ہے۔ یہ بھی قابل گرفت فروگزاشت ہے۔ اس حدیث مبارک ﷺ میں ’علماء‘ جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ یوں نہیں فرمایا گیا کہ ’عالم انبیاء کا وارث ہے‘۔ کیوں؟ آخر اس میں کیا حکمت ہے؟ راقم کی محتاط رائے میں جمع کا صیغہ یہ لطیف اشارہ دے رہا ہے کہ کوئی شخص انفرادی حیثیت میں انبیاء کی وراثت کے تقاضے نہیں نبھاسکتا کہ انبیاء کی شخصیت اور دعوت ہمہ گیر وہمہ جہت ہوتی ہے۔ جہاں تک رسول پاک ﷺ کی ذات گرامی اور آپ کی سیرت طیبہ کا تعلق ہے، وہ قرآن مجید، فرقان

☆ شعبہ سیاسیات، گورنمنٹ ڈگری کالج، قلعہ دیدار سنگھ

حمید کی ”عملی تفسیر“ ہے۔ کون نہیں جانتا کہ قرآن مجید اپنے اندر بے شمار امکانات رکھتا ہے، بالکل اسی طرح نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی بھی بے شمار امکانات کی حامل ہے۔ لہذا اگر ہم ماہر فقہ کو عالم تسلیم کر بھی لیں تو سوال اٹھتا ہے کہ کیا انبیاء کرام کی دعوت (بالخصوص خاتم النبیین ﷺ کی دعوت) محض ”فقہ“ کے گرد گھومتی تھی؟ کیا کوئی ”فقہ“ سیرت النبی ﷺ میں مضممر امکانات کا احاطہ کر سکتا ہے؟ یقیناً نہیں۔ تو پھر ضرورت اس امر کی ہے کہ انبیاء کرام کی وراثت کے دعویدار حضرات فقہ کے علاوہ ان دیگر پہلوؤں کو بھی تلاش کریں جو ان کی شخصیت و دعوت میں امتیازی اہمیت رکھتے تھے۔ راقم کی نظر میں قرآن مجید آخری الہامی کتاب ہونے کی حیثیت سے اور محمد مصطفیٰ ﷺ آخری نبی ہونے کی حیثیت سے تمام قسم کے ”امکانات“ پر حاوی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی پاک ﷺ کی وراثت کے تقاضے نبھانے کے لیے (تصورِ خاتمیت کے تحت) امکانات کو چھونے کی سکت بھی ہونی چاہیے۔ آخر ان امکانات کو کیسے چھوا جا سکتا ہے؟ کیا اجتہادی نور کی روشنیوں کے بغیر ایسا ہو سکتا ہے؟ اہم بات یہ ہے کہ اگر ہم لوگ اس مطلوب اجتہادی نور کو نہیں اپناتے، تو اس کا حقیقت میں یہ مطلب ہوگا کہ ہم لوگ (نعوذ باللہ) دین کے تصورِ خاتمیت سے عملاً منحرف ہیں، جو ہمارے دین کی امتیازی پہچان ہے اور جس کی وجہ سے ہمارے دین اور سابقہ شریعتوں میں بنیادی فرق ہوتا ہے۔

چونکہ آپ ﷺ کی ذات گرامی ﷺ ”مثالی نمونہ“ ہے اس لیے دین کی اس امتیازی صفت یعنی تصورِ خاتمیت سے پھوٹنے والی اجتہادی جہت کی مثال بھی آپ کی سیرت طیبہ سے مل جاتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی، یا رسول اللہ مجھ میں چار بری خصلتیں ہیں۔ ایک یہ کہ بدکار ہوں، دوسری یہ کہ چوری کرتا ہوں، تیسری یہ کہ شراب پیتا ہوں، چوتھی یہ کہ جھوٹ بولتا ہوں۔ ان میں سے جس کو فرمائیے، آپ ﷺ کی خاطر چھوڑ دوں۔ ارشاد فرمایا کہ جھوٹ نہ بولا کرو۔ چنانچہ اس نے عہد کیا۔ جب رات ہوئی تو اس کا شراب پینے کو جی چاہا اور پھر بدکاری کے لیے آمادہ ہوا، تو اس کو خیال گزرا کہ صبح کو جب رسول کریم ﷺ استفسار فرمائیں گے کہ رات تم نے شراب پی اور بدکاری کی تھی؟ تو کیا جواب دوں گا۔ اگر ہاں کہوں تو شراب اور زنا کی سزا دی جائے گی اور اگر نہیں کہوں تو عہد کے خلاف ہوگا۔ یہ سوچ کر ان دونوں سے باز رہا۔ جب رات گزری اور اندھیرا چھا گیا تو چوری کے لیے گھر سے نکلنا چاہا۔ پھر اسی خیال نے اس کا دامن تھام لیا کہ کل پوچھ گچھ ہوئی تو کیا کہوں گا؟ ہاں کہوں گا تو ہاتھ کٹے گا اور نہیں کہتا ہوں تو بد عہدی ہوتی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس جرم سے باز آ گیا۔ صبح ہوئی تو وہ بارگاہ رسالت ﷺ میں حاضر ہوا اور عرض کی، یا رسول اللہ! جھوٹ نہ بولنے سے چاروں بری خصلتیں مجھ سے جھوٹ گئی ہیں۔ یہ سن کر رسول کریم ﷺ بہت مسرور ہوئے۔

اس حدیث مبارک میں مضممر جہانِ حکمت سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کی ذات گرامی کے اس بیش بہا پہلو کو کہ آپ ﷺ نے چار قباحتوں میں سے بنیادی قباحت کو ”ایڈریس“ کیا، جس سے دیگر قباحتوں پر بھی باآسانی قابو پایا گیا، آج کے دور میں کیوں پیش نظر نہیں رکھا جا رہا؟ کیا اس کا سبب یہ نہیں کہ چونکہ ہمارے علماء اصل میں ”ماہر فقہ“

ہیں، اسی لیے شعور نبوت کی پیروی کے بجائے انبیاء کرام کی وراثت کے تقاضوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے خالصتاً فقہی انداز میں معاملات کو دیکھتے ہیں۔ ان کی نظر جھوٹ کے بجائے دیگر تین معاملات پر زیادہ ہے۔ چوری، زنا، شراب اور اسی نوعیت کی دیگر قباحتوں پر انھوں نے دفتروں کے دفتر لکھ ڈالے ہیں، لیکن جھوٹ پر یوں کھجیے کہ ایک چھوٹی سی تختی بھی موجود نہیں۔ حالانکہ اس حدیث مبارک ﷺ سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ جھوٹ باقی قباحتوں کی ”جز“ ہے۔ پھر ہمارے ہاں معاملات کو ایڈریس کرنے میں یہ افراط و تفریط آخر کیونکر ہے؟ اس کی وجہ ایک ہی ہے کہ علماء، فقہ کے سحر کا شکار ہو کر تصور خاتمیت سے دور ہو گئے ہیں۔ ان میں اتنی سکت نہیں کہ معاشرتی معاملات کو ”اجتہادی نظر“ سے دیکھ سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت بھی ہمارے معاشرے میں یہ تمام قباحتیں عروج پر ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ علماء ابھی تک مصر ہیں کہ شریعت نافذ کی جائے۔ شریعت نہ ہوئی، جادو کی چھڑی ہو گئی کہ اس کے حرکت میں آتے ہی ’خلافت راشدہ‘ کا عہد لوٹ آئے گا۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ جس عہد کی بازیافت چاہتے ہیں، خود اپنے احوال و ظروف میں اس مثالی عہد کے تصورات کو سمونے کی بجائے (۳) بعد کے تصورات کو لیے بیٹھے ہیں۔ راقم کی رائے میں تو فقہی انداز میں معاملات کو دیکھنے کا مطلب کچھ ایسے ہی ہے کہ کنویں میں مرا ہوا کتا موجود ہو، اور پانی کے چند ڈول باہر پھینک کر یہ کہا جائے کہ ”کنواں پاک ہو گیا“۔ اس وقت ہمارے معاشرتی کنویں میں مرا ہوا کتا ”جھوٹ“ ہے (۴) سطح پر نظر آنے والے ”چند مظاہر“ کے ڈول باہر پھینک دینے سے یہ کنواں پاک نہیں ہوگا۔ اگر مرے ہوئے کتے کو نکال باہر پھینکا جائے، تو بار بار ڈول نکالنے کا تکلف نہیں کرنا پڑے گا۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ مرا ہوا کتا ”فقہ“ نکالے گا؟ کیا یہ ”فقہ“ کا منصب ہے کہ ”جھوٹ“ کو ایڈریس کرے؟ راقم کے خیال میں یہ کام فقہ کا نہیں، آرٹ کا ہے۔ (۵)

اسی بات کا ایک اور رخ نہایت قابل غور ہے کہ فقہ کو دین اور فقہ کو عالم تسلیم کرنے سے مسلم ذہن نے ہمیشہ انکار کیا ہے۔ یہ انکار، تفہیم و اظہار کی لطیف سطح پر بہت بلیغ انداز میں کیا گیا ہے۔ راقم کا اشارہ اردو شاعری میں مقبول ترکیب ”فقہیہ شہر“ کی جانب ہے۔ کیا کوئی ایسا شعر بھی ہے جس میں فقہیہ شہر کو نرمی سے اور بغیر طنز کے مخاطب کیا گیا ہو؟ اس ترکیب کا اسی انداز میں متواتر اور مسلسل استعمال اور پھر مسلم معاشرے کا اس پر لبیک کہنا، اس فرمان رسول ﷺ کے عین مطابق ہے کہ ”میری امت گمراہی پر متفق نہیں ہو سکتی“۔ جن لوگوں کو دین کے فقہی ایڈیشن پر اب بھی اصرار ہو، ان سے فقط ہمدردی ہی کی جاسکتی ہے۔

اب اگر ہم فقہی خول اتار کر دینی حوالہ پیش نظر رکھیں تو ہماری نظر اس آرٹ پر پڑتی ہے جس کا تعلق خطابت، گفتگو، اور مکالمے سے ہے۔ اس حوالے سے رسالت مآب ﷺ کا کوہ صفا پر خطاب سامنے آتا ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ آپ ﷺ نے وہاں کیا انداز خطابت اختیار فرمایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم سے کہوں کہ وادی میں ایک لشکر اتر آیا ہے جو تم پر حملہ کرنے والا ہے تو کیا تم میری بات کو سچ مانو گے؟ انہوں نے جواب دیا، ہاں! تم ہمیشہ ہمارے تجربے میں

سچے ثابت ہوئے ہو۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے میں نذیر یعنی تمہیں متنبہ کرنے والا ہوں کہ تمہارے آگے سخت عذاب موجود ہے۔ یہ سن کر ابولہب نے کہا، تیرے لیے سارے دن موجب ہلاکت و بربادی ہوں، کیا تو نے اسی لیے ہمیں جمع کیا تھا؟ اس پر مجمع منتشر ہو گیا۔

کوہ صفا کے اس واقعے پر بغور نظر دوڑائیں۔ مخاطبین کا پہلا جواب رسول پاک ﷺ کے ”سٹیٹس“، کو ظاہر کر رہا ہے۔ وہ لوگ آپ ﷺ کی جملہ صفات سے بخوبی آگاہ ہیں اور ان کا اعتراف بھی کر رہے ہیں۔ اس اعتراف کی روشنی میں دوسرا جواب ”غیر متوقع“، معلوم ہوتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ راقم کی ناقص رائے میں اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کے خطاب مبارک سے جو فضا وہاں پر اس وقت قائم ہوئی، وہ سراسر شعورِ انسانی کو ایڈریس کرنے والی تھی۔ آپ ﷺ نے اپنے سٹیٹس کے ذریعے ان کے جذبات کو ”ہائی جیک“ کرنے کی بجائے ان کے شعور کو مخاطب کیا۔ اگرچہ ان کے جذبات سے کھیل کر انہیں فوری طور پر مائل بہ اسلام کیا جاسکتا تھا، جس سے وہ عارضی طور پر تو مسلمان ہو جاتے لیکن ان کی روح کی گہرائیوں میں اسلام کی جڑیں مضبوط نہ ہونے سے وہ کردار نہ بنتا جس کا اظہار حبشہ میں مسلم وفد نے کیا (۶)۔ آج مسلم معاشرے میں ”کردار“ اسی لیے سامنے نہیں آ رہا کہ ہمارا خطیب شعورِ نبوت کی پیروی کے بجائے مداری گری طرح لوگوں کے جذبات سے کھیل رہا ہے، غوغا آرائی اور شور شرابہ کر رہا ہے۔ جھوٹا آرٹ جھوٹ کو کیسے ختم کر سکتا ہے؟ یہ سچ ہے کہ جذباتی فضا قائم کر کے وقتی طور پر ”اسلامیت“ ظاہر کی جاسکتی ہے، چندہ نکلوایا جاسکتا ہے، سہ روزے، چالیس روزے کا ”ارادہ“ کروایا جاسکتا ہے، نوجوانوں کو بارڈر پر بھیجا جاسکتا ہے، لیکن بہر حال اس فضا سے وہ ”کردار“ نہیں بن سکتا جو صرف اور صرف شعورِ انسانی کو مخاطب کرنے سے ہی سامنے آ سکتا ہے۔ بغرض مجال اگر کہیں کہیں خلوص جھلکتا ہے تو بھی ہمارے خطیب کے خطاب کی نوعیت ”پراپیگنڈا“ والی ہوتی ہے۔ حالانکہ ہمارے نبی کریم ﷺ کے تمام خطبات گواہ ہیں کہ رسول کے فنِ خطابت میں پراپیگنڈے کا عمل دخل نہیں ہوتا، کیونکہ پراپیگنڈا کے پیچھے دوسرے کو ”پھانسنے“ کی نفسیات کام کر رہی ہوتی ہے، جبکہ شعورِ نبوت، ہر حوالے سے ہر سطح پر شعور کو خطاب کرتا ہے کہ وہ ”آزادانہ“ فیصلہ کرے۔ لا اکراہ فی الدین کے یہی معنی ہیں۔ یہاں پر پھر وہی ”اجتہادی روح“ نظر آتی ہے جو اسلام کی امتیازی صفت ”تصورِ خاتمیت“ کا نتیجہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پراپیگنڈا والے انداز کے بجائے ”اجتہادی طریق“ کو خطاب میں سمویا جائے۔ سوال پیدا ہوتا ہے شعورِ انسانی کو خطاب کرنے کے اس ”نبوی آرٹ“ سے ہم کب تک پہلو تہی کریں گے؟

اسی بات کو اگر دوسرے رخ سے دیکھیں تو نہایت سنگین صورت حال سے پالا پڑتا ہے۔ کہتے ہیں کہ فطرت، روح انسانی ہے اور روح کے نہاں خانوں میں انسان کے مذہبی عقائد کی جڑیں ہوتی ہیں۔ آرٹ کے ذریعے روح اظہار کرتی ہے، یعنی انسان کے انتہائی اندرونی عقائد، منظرِ عام پر آتے ہیں۔ اس طرح آرٹ کی وہ قسم جسے خطابت کہا جاتا ہے، یہی ظاہر کرتی ہے کہ ہمارے خطیبوں کا ”ذہنی ادراک“، انتہائی حد تک ناقص ہے۔ ان کے موضوعات، مواد،

الفاظ کا چناؤ اور اپروچ یہی چغلی کھاتے ہیں کہ ان کا دینی ادراک، گھن گرج، چیخ پکار، لفظی مباحث، گجت بازی، جذباتیت اور فروعی مسائل کے گرد گھومتا ہے۔ اگر موسیقی کو جذبات انگیز قرار دے کر ہم اس کی بابت بہت ”حساس“ ہو سکتے ہیں تو ایسی حساسیت کا مظاہرہ، مشترکہ علت کی بنا پر ایسے فن خطابت کے حوالے سے بھی ہونا چاہیے جو لوگوں کے جذبات ”ہائی جیک“ کرنے کو اوڑھنا بچھونا بنا چکا ہو۔ راقم کو یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ مذہبی طبقے کے فن خطابت کا فنی جائزہ یہی مترشح کرتا ہے کہ ان کا دینی ادراک ”ابلیسیت زدہ“ ہے۔ اگر صورت حال اس کے برعکس ہوتی تو معاشرہ بھی بہت مختلف ہوتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ شعورِ نبوت کی پیروی اختیار کی جائے، اس آرٹ پر ایسی کتب لکھی جائیں جن میں نبی ﷺ کے فن خطابت پر سیر حاصل بحث ہو اور تصورِ خاتمیت کے تحت اجتہادی روح بھی متحرک ہو، پھر ایسی کتب کو دینی نصاب میں باقاعدہ جگہ دی جائے، تاکہ یہ آرٹ دین کی معاشرتی ترویج میں مدد و معاون ثابت ہونے کے افراتفری کو ہوا دے۔

دین کی ترویج میں آرٹ کی اہمیت کا اندازہ خطبہ الوداع کے اس نکتے سے واضح ہو جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جو لوگ یہاں موجود ہیں، انہیں چاہیے کہ یہ احکام اور یہ باتیں ان لوگوں کو بتادیں جو یہاں نہیں ہیں، ہو سکتا ہے کہ کوئی غیر موجود تم سے زیادہ سمجھنے اور محفوظ رکھنے والا ہو“۔ مسلمانوں نے اس حکم رسول کریم ﷺ کی پیروی میں پیغامِ رسائی اور ”بتا دینے کو“ اجتہادی رنگ و نور سے بہت بڑا آرٹ بنا ڈالا۔ اس فرمانِ مبارک ﷺ سے ہی وہ آرٹ متشکل ہونا شروع ہوا جو حدیث شریف اور اسماء الرجال سے ہوتا ہوا ابنِ خلدون کے مقدمے تک جا پہنچا۔ برصغیر میں سرسید احمد خان کی علی گڑھ تحریک کی یہی بنیادی خوبی ہے کہ اس نے مسلمانوں کی توجہ دوبارہ اس آرٹ کی طرف مبذول کرائی۔ اس تحریک نے تاریخ اور ابلاغ کے آرٹ کا احیا کیا۔ الطاف حسین حالی کی ”مسدس“ اور شبلی نعمانی کی ”سیرت النبی ﷺ“ اسی آرٹ کا پیش بہا اظہار ہیں۔ راقم کی رائے میں تو برصغیر کی مسلم معاشرت پر ”فتاویٰ عالمگیری“ کے اثرات اس حد تک مرتب نہیں ہو سکے، جس حد تک گہرے نقوش ”سیرت النبی“ اور ”مسدس حالی“ نے چھوڑے ہیں۔ بہر حال خطبہ الوداع کے اسی نکتے کی پیروی میں، جس طرح صحابہ کرامؓ نے (غیر فقہی انداز میں، کہ فقہ پر اس طرح زور ہی نہیں دیا جا رہا تھا) اسلام کو پوری دنیا میں پھیلا دیا، وہ اپنی جگہ ایک مثال ہے۔ بحث کے اس مقام پر تبلیغ کو بطور ”ارفع آرٹ“ دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کیا تبلیغ ارفع آرٹ نہیں ہے؟ کیا اس آرٹ کو ”تصورِ خاتمیت“ سے الگ رکھا جاسکتا ہے؟ کیا نبوت کے خاتمے کے بعد یہ ذمہ داری خالصتاً مسلمانوں کے سپرد نہیں ہو جاتی کہ وہ قولی، عملی، تحریری و دیگر انداز سے اس الہیاتی پیغام کو، مکمل حد تک اس کے امکانات پر تھکھول کھول کر، تمام عالمِ انسانیت تک پہنچاتے رہیں؟ لہذا ہمارے لیے اہم ہو جاتا ہے کہ تبلیغ کی کسی بھی سطح اور نوع کو جانچتے وقت اس میں جاری ”اجتہادی روح“ کو تلاش کریں، (یعنی اس کی ’اپروچ‘ کیا ہے، کیا یہ شعورِ انسانی کو خطاب کرتی ہے؟) اگر یہ موجود ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تصورِ خاتمیت اس میں پوری شان سے موجود ہے اور مبلغ کا ”دینی ادراک“ بھی ابلیسیت سے محفوظ

ہے۔ خیال رہے، یہاں تبلیغ کو ارفع آرٹ اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کے اندر ہی خطابت، گفتگو، مکالمہ، تحریر اور خطاطی وغیرہ آجاتے ہیں۔ خطیب بھی ایک طرح سے تبلیغ کر رہا ہوتا ہے، اس کا ذکر ہو چکا۔ اب ادیب کی بات ہو جائے، جس کا ضمنی ذکر سطور بالا میں ہوا۔

یہ بڑی عجیب اور افسوس ناک بات ہے کہ ہمارے ہاں جس تحریر کو ”دینی“ سمجھا جاتا ہے، اسے شاید دینی کے علاوہ اور سب کچھ کہا جاسکتا ہے۔ ذرا ”دینی رسائل“ کے محض عنوانات پر ہی سرسری نظر ڈال لیجیے، آپ اپنا سر پیٹ لیں گے۔ ان کے مدیران کا دینی درک تو ”سرورق“ سے ہی فاش ہو جاتا ہے کہ رسالے کی پیشانی پر حلی حروف میں لکھا ہوتا ہے: ”فلاں..... کا ترجمان“ یہ کیا ہے؟ یہ آرٹ کی کون سی سطح ہے؟ کیا یہ سطح، تصویر خاتمیت سے میل کھاتی ہے؟ راقم کی نظر میں فروعی اختلافات پڑتی کتابیں اور ان اختلافات کو بھڑکانے والے رسائل و جرائد، حقیقت میں ان لوگوں کے روحانی میل کچیل اور ذہنی کثافت کی علامت ہیں جن کے ہاں تصویر خاتمیت ”دھندلا“ گیا ہے، جس کے سبب سے اجتہادی نور بھی ان سے گریزاں ہے۔ یہ کوئی اچھے کی بات نہیں کہ ایسے میں اپنی روح اور اپنے اساسی الہام سے بچھڑ کر ثانوی چیزوں کو ہی ”بنیادی“ تسلیم کر لیا جائے اور لوگوں کو انتہائی سطحی آرٹ کے ذریعے گمراہ کرنے کی کوشش کی جائے کہ لیجیے ہم نے ”سونے کا انڈہ“ دے دیا ہے۔

اگر ”دینی ادب“ میں موضوع اور مواد کے اعتبار سے شاذ شاذ کام کی چیز نظر بھی آتی ہے تو ”اپروچ“ کے حوالے سے پراپیگنڈا سے سابقہ پڑتا ہے۔ تزکیہ نفس سے لے کر تاریخی واقعات کے بیان تک، ہر جگہ کچھ ایسی ہی صورت حال ہے۔ نسیم حجازی کی تصانیف دیکھ لیجیے، اور سچ سچ بتائیے کہ ان کا اثر جذبات پر پڑتا ہے یا شعور پر؟ آرٹ کی یہ سطح، عہد رفتہ کے مقابری مجاوری کی مانند ہے اور مجاوری کبھی شعور نہیں بخشتی۔ اسی طرح دیگر مصنفین بھی موضوع کے انتخاب اور مواد کے چناؤ میں ”خلوص“ کا نمونہ نظر آتے ہیں لیکن چونکہ ان کا دینی ادراک (تصور خاتمیت دھندلانے سے) اجتہادی روح میں گندھا ہوا نہیں ہوتا، اس لیے وہ جبراً اور پراپیگنڈے کی بھول بھلیاں میں گرفتار ہو جاتے ہیں جس کے باعث معاشرے پر ان کی تحریروں کے اثرات نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں کیونکہ قاری محض وقتی طور پر، جذبات کی سطح تک ہی متاثر ہوتا ہے۔

اسی سلسلے کا اہم نکتہ یہ ہے کہ حقیقت میں دینی ادب کی اصطلاح ہی عجیب و غریب ہے۔ کیونکہ ادب، انسان کی شخصیت، اس کے باطن، اس کے وجدان کا اظہار ہے۔ اس کا مخرج وہ مقام ہے، جہاں انسان کے مذہبی عقائد پڑاؤ ڈالے ہوتے ہیں۔ اس طرح ادب (ہر سطح کا)، ہوتا ہی دینی ہے، البتہ اس کے ذریعے فرد کے دینی عقائد کی نوعیت کا پتہ ضرور چل جاتا ہے۔ مذہبی طبقے کے ”باطنی اظہار“ کے متعلق بات ہو چکی۔ اگر ہم غیر مذہبی طبقے کی طرف دیکھیں تو وہاں بھی صورت حال مختلف نہیں ہے۔ یہ طبقہ آج کل بڑے زور و شور سے رونا رورہا ہے کہ عوام الناس، مطالعہ ادب سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ان سے گزارش ہے کہ بھی عوام ایسے ادب کی طرف مائل کیوں ہوں گے جس کے پیچھے

روحانی و باطنی سرچشمے کے بجائے محض خارجی واقعیت کا جبر بھلکتا ہو۔ معلوم یہی ہوتا ہے کہ اس وقت مذہبی اور غیر مذہبی آرٹسٹ، جھوٹے آرٹ کو فروغ دے رہا ہے۔

اگر ہم اپنی معاشرتی برائیوں کی فہرست مرتب کریں تو یہ بہت طویل ہوگی۔ صرف موٹی موٹی برائیوں کو ہی گن لیں، مثلاً کرپشن، رشوت، جھوٹ، قانون شکنی، نمود و نمائش، دولت کی ہوس، طاقت کی بھوک، اپنی اپنی دوڑ وغیرہ وغیرہ۔ اب ذرا بتائیے کہ انہیں ایڈریس کرنے کے لیے کیا ”آرٹ“ کی ضرورت نہیں ہے؟ کیا لوگوں میں سادگی، محبت، اخوت، انکساری، رحم، رواداری، صدق، قانون پسندی، قناعت، ایثار وغیرہ آرٹ کے بغیر پیدا کیے جاسکتے ہیں؟ راقم کی نظر میں ایسا نہیں کہ ہماری سوسائٹی میں آرٹ موجود نہیں، کیونکہ کوئی سوسائٹی بغیر آرٹ کے نہیں ہو سکتی۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے ”جھوٹا آرٹ“ ہماری جڑوں میں بیٹھ گیا ہے۔ موجودہ معاشرتی ابتری، اسی آرٹ کا ”عطیہ“ ہے جسے ہم بھگت رہے ہیں۔ اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے ہاں ”نقد و انتقاد“ کے پلیٹ فارم سے جھوٹے اور سچے آرٹ پر بحث کی جائے۔ راقم کی رائے میں سچا آرٹ وہی ہے جس میں ”تصورِ خاتمیت“ بھلکتا ہو۔ لہذا ہمارے لیے لازمی ٹھہر جاتا ہے کہ تصورِ خاتمیت کے معنوی ابعاد مسلسل آشکار کرتے رہیں۔ اس سلسلے میں چند نکات پیش خدمت ہیں۔ تصورِ خاتمیت تقاضا کرتا ہے کہ آرٹ کے ہر نمونے میں:

(۱) وحدتِ انسانیت رچی بسی ہو۔

(۲) مساواتِ انسانی کا پیغام ہو۔

(۳) مساوات کے قیام کے لیے انسان سے ماورا ہستی کا اثبات موجود ہو۔

(۴) تکریمِ انسانیت کا سبق آفتاب کی مانند واضح ہو۔

(۵) عورت کو شے کی بجائے انسان گردانا جاتا ہو۔

(۶) کمتر اور مخلوموں سے اعلیٰ حسن سلوک کی تعلیم ہو۔

(۷) انفرادی و گروہی تشخص کی تسلیمیت پنہاں ہو۔

(۸) جبر کی نفی کا تاثر بھر پور ملتا ہو۔

یہ چند نکات ہیں۔ انہیں ”ذہنی ادب“ پر منطبق کیجیے، خاصی شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔ ہمارے مذہبی طبقے کا بڑا مسئلہ یہی ہے کہ اسے آرٹ کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں۔ یہ طبقہ لگے بندھے اصولوں پر دین کی ”معاشرتی ترویج“ کے لیے کوشاں ہے۔ اس کے ہاں یہ سوچ پائی جاتی ہے کہ فقہی ڈنڈے سے اصلاحِ عام ہو جائے گی۔ اگر یہ طبقہ اور دوسرا ادبی طبقہ بھی، تصورِ خاتمیت کی روح کو تھام لے تو عظیم تبدیلی رونما ہو سکتی ہے۔ نماز، روزے، حج، زکوٰۃ، سنتِ نبوی ﷺ کی پیروی اور دیگر احکامات اگر شعورِ انسانی کو مخاطب کرنے والی ”اپروچ“ سے مکالموں، انشائیوں، ناولوں وغیرہ میں پیش کیے جائیں تو اس کے اثرات زیادہ تیزی سے اور دور رس مرتب ہوں گے۔ مثلاً ناول کے کسی کردار کو اس طرح

”ایکٹ“ کرتے دکھایا جاسکتا ہے کہ ”جب اس کی آنکھ کھلی تو گھڑی پانچ بج چکی تھی، وہ جلدی جلدی ہاتھ منہ دھونے کی نیت سے اٹھا، لیکن پھر اسے خیال آیا، اوہو! آج تو جمعہ ہے، غسل کرنا چاہیے.....“۔ اس طرح قاری کو جمعہ کے دن کی فضیلت اور غسل کے مسائل (غیر فقہی زبان میں) سمجھائے جاسکتے ہیں، کچھ اس طرح کہ شاید وہ دوبارہ کبھی نہ بھولے۔ اسی طرح دیگر ضروری احکام جن کی بابت آگاہی تمام مسلمانوں کے لیے لازمی ہے، بہت فنکارانہ انداز میں قارئین کے اذہان میں نقش کیے جاسکتے ہیں۔ تبلیغ کی وہ سطح ہوگی، جس میں اجتہادی رنگ نظر آئے گا کہ ہر لکھاری بہتر سے بہتر اور منفرد انداز سے قلم اٹھائے گا۔ راقم کے خیال میں ہمارے معاشرے میں ”السلام علیکم“ کہنے کی ریت، آرٹ کے توسط سے آئی ہے، فقہی شہر کی چیخ پکار کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ اسی طرح الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے بہت بڑی تبدیلی رونما ہو سکتی ہے، اگر ہماری ”اپروچ“ پراپیگنڈا کی بجائے شعور کو ایڈریس کرنے والی ہو۔

آرٹ کے دیگر نمونوں پر بھی مذکورہ بالا نکات کا انطباق کرنے سے انتہائی غیر تسلی بخش صورت سامنے آتی ہے۔ فرن تعمیر کو ہی لپیچے اور مساجد کے ”جغرافیہ“ پر ناقدانہ نظر دوڑائیے۔ پہلی نظر میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ چونکہ یہ اسلامی معاشرہ ہے اس لیے مسلمانوں کی کثیر تعداد کے پیش نظر مساجد کندھے سے کندھا ملائے کھڑی ہیں۔ لیکن جب معاملے کو ذرا گہرائی سے دیکھیں تو پسینہ چھوٹ جاتا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مساجد کے ماتھے ”بیٹوں کے فتور“ کا برملا اظہار کر رہے ہوتے ہیں۔ مسجد عام طور پر اس لیے نہیں بنائی جاتی کہ فلاں علاقے میں مسجد کی ”ضرورت“ ہے بلکہ تعمیر اس لیے اٹھائی جاتی ہے کہ فلاں علاقے میں ”ہماری“ مسجد موجود نہیں۔ اب انصاف سے فیصلہ کیجیے کہ جب مسلم معاشرت کی اجتماعیت کی پہلی اکائی کے پیچھے ایسی نیت ہے جو تفریق ڈالنے والی ہے، تو پھر ہم (خاص طور پر مذہبی طبقہ) شور شرابہ کر کے آسمان سر پر کیوں اٹھائے ہوئے ہیں کہ مسلمان ”متحد“ نہیں ہوتے۔ بہت صاف اور کھری سی بات ہے کہ ”فرن تعمیر“ کسی قوم کے باطن کو متشکل کرتا ہے۔ ہندوؤں کے گھروں، مجلوں وغیرہ کی پیچیدگی، تنگی اور اندھیارے سے ان کے باطن (مذہبی عقائد) کا بعینہ اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح ہمارا فرن تعمیر بھی ہمارے دینی ادراک کا اظہار ہے۔ ہم تو تعمیر کے لیے جگہ کے انتخاب یعنی ”جغرافیہ“ پر آکر ہی اٹک جاتے ہیں کہ دینی درک ”منقسم“ کرنے والا دکھائی دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمارا دین یہ کہتا ہے کہ تفرقے میں پڑ جاؤ؟ اگر نہیں، تو پھر ”مسجد ضرار کی توسیع“ کیوں نظر آرہی ہے؟ اس کا جواب ایک ہی ہے کہ ہمارا دینی ادراک، ابلیسیت زدہ ہو چکا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ فقہ ایسی مساجد کے لیے ”جوازات“ تلاش کر لے، لیکن آرٹ کی سطح سے، اس کا دفاع کرنا ممکن نہیں۔ راقم کی رائے میں ان مساجد کے قیام کے پیچھے بنیادی طور پر ”پراپیگنڈا“ کی نفسیات کام کر رہی ہوتی ہے نہ کہ شعور انسانی کو خطاب کرنے کی ذمہ داری کا جمالیاتی احساس۔

مساجد کی تعمیر کے پیچھے جس قسم کی نیت نظر آتی ہے، اسی قسم کے ارادوں کا اظہار دیگر اجتماعی اداروں کے پس منظر میں بھی جھلکتا ہے۔ جی ہاں! عیدین ”اپنے اپنے فرقے“ کے مولوی صاحب کے پیچھے ہی ادا ہوتی ہیں، اگرچہ نماز کی

ادائیگی کے بعد ”کسی اور پلیٹ فارم“ پر یہی متفرق لوگ ”آپس میں“ مل بیٹھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مذہب تو لوگوں کے مابین ”تفریق“ ڈالتا ہے لیکن دیگر معاشرتی رشتے ناتے انہیں آپس میں گوندھ دیتے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ ہمارے مذہبی طبقے کے سامنے یہ بہت بڑا سوال ہے۔ عیدین کے مواقع پر ایسا اکثر ہوتا ہے کہ جو لوگ خوش قسمتی سے کسی فقیر شہر کے ”تنگنائے فکر“ کے حصار میں نہیں ہوتے، (آرٹ کے رسیا ہونے کے باعث)، وہ منہ اٹھائے کسی بھی اجتماع میں جاگھتے ہیں۔ شاید ایسے لوگ ہی اجتماع کی اصل روح کی ”کفایت“ ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے علاوہ جو لوگ زیادہ حساس ہوتے ہیں، ان کی نفاست طبع انہیں اجتماع میں جانے سے روک لیتی ہے (آخر لطافت کا کثافت سے کیا میل؟) ان حالات کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا یہ بھی امریکہ کی سازش ہے؟

ہماری سب سے بڑی اجتماعی علامت حج ہے۔ یہ علامت بھی مسجد اور عیدین کی طرح موجود تو ہے، لیکن اس کا ادراک بھی آلودہ ہو چکا ہے۔ اب ماضی کی نسبت لوگوں کی بہت بڑی تعداد حج کرتی ہے۔ جس نسبت سے تعداد بڑھ رہی ہے، اسی نسبت سے ”حاجی“ کے معنی بھی معنی خیز ہوتے جا رہے ہیں۔ حج کے موقع پر مسلمانوں کو ”بلیس“ کی پہچان بھی کرائی جاتی ہے، جمرات کا مقصود بلیس کو دھتکارنا بھی ہے اور لکارنا بھی۔ ستم ظریفی کی انتہا دیکھیے کہ اب ان دھتکارنے لکارنے والوں پر معاشرہ ”جمرات“ کرتا ہے، لطائف بنا کر، پھبتیاں کس کر، ان پر کنکریاں مارتا ہے۔ اگر ہم حقیقت سے آنکھ چرانا چاہیں تو الگ بات ہے ورنہ صورت حال یہی ہے۔ یہاں بھی سوال یہ ہے کہ اس صورت حال کا ذمہ دار کون ہے؟ راقم کی نظر میں بات وہی ہے کہ ہمارا مذہبی طبقہ آرٹ سے بے بہرہ ہے۔ اس لیے نہ صرف وہ خود اجتہادی روح سے بیگانہ ہو کر اندھیرے میں ٹامک ٹونیاں مار رہا ہے بلکہ سادہ لوح عوام کو بھی شعور دینے سے قاصر ہے۔ جس طرح ”السلام علیکم“ کی ریت غیر مذہبی طبقے نے ڈالی ہے، اسی طرح اجتماعیت کی اصل روح کا ادراک بھی (جو کہیں کہیں نظر آتا ہے) اسی طبقے نے دیا ہے۔

اجتماعیت کی یہ بات فرین تعمیر سے چلی تھی۔ رسول کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ ”مومن کی دولت کو جو چیز کھا جاتی ہے اور نفع نہیں پہنچاتی، وہ عمارت ہے“۔ اس حدیث مبارک ﷺ کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے کہ پرشکوہ عمارتیں ہمارے دینی ادراک کا اظہار نہیں ہیں۔ البتہ یہ ہماری ”آرزوؤں“ کا نوحہ ضرور ہیں۔ جب ہم لوگ دین کی عالمگیر، آفاقی اور اجتہادی روح کو باہم رشتوں، رویوں میں سمونہیں پاتے تو یہ روح، پرشکوہ اور شاندار عمارتوں کی صورت میں (گنبد، مینار وغیرہ آفاقیت کی علامت ہیں) اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ راقم کے خیال میں جب مسلم معاشرت نے دینی ادراک کا اظہار، باہم رشتوں ناتوں میں کرنا شروع کر دیا تو ایسی پرشکوہ عمارتیں بننا بند ہو جائیں گی کہ روح کو اظہار کا اصل راستہ مل جائے گا۔ صحابہ کرامؓ کے دور میں یہ روح چونکہ آرزو نہیں، بلکہ اظہار کر رہی تھی، اس لیے پرشکوہ عمارتوں کا سلسلہ ہائے دراز اس عہد میں نہیں ملتا۔

دین اسلام کا تصور خاتمیت انسان کے ”آزاد اور ذمہ دار“ رویے پر بھی دلالت کرتا ہے۔ اس طرح ہونا یہ

چاہیے تھا کہ اسلامی ادب (اور آرٹ کی دیگر اقسام) کی اپروچ، آزادانہ اور ذمہ دارانہ ہوتی، جس کے نتیجے میں عالمی ادب کا کثیر حصہ مسلمانوں کی تحریروں پر مشتمل ہوتا۔ لیکن تصور خاتمیت دھندلانے سے، آزادی اور ذمہ داری کی دونوں خصوصیات مسلمانوں کے دینی ادراک سے یکسر اٹھ گئیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ”وحدت انسانیت“ کا خواب بکھر کر رہ گیا۔ یہودی اور عیسائی ”آرٹ“ کے پلیٹ فارم سے بھی وحدت انسانیت کو فروغ نہیں دے سکتے تھے، کیونکہ یہودی موحد ہوتے ہوئے بھی نسل پرست ہیں، عیسائی اگرچہ نسل پرست نہیں لیکن ان کے ہاں توحید نہیں پائی جاتی۔ اس طرح صرف اسلام کے پیروکار ہی موحد ہیں اور (تصور خاتمیت کے توسط سے) ساتھ ساتھ وحدت انسانیت کے علمبردار بھی۔ سورۃ نساء میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ”لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد اور عورت دنیا میں پھیلا دیے“، سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے تین بڑے گروہ (جو اپنے اپنے تئیں اپنی ہی اپروچ کو دین سمجھتے ہیں یعنی فقہی، جہادی اور تبلیغی) موحد ہوتے ہوئے بھی وحدت انسانیت کے فروغ کی ضمانت دیتے ہیں؟ کیا فقہ، انسانوں کو ایک لڑی میں پروکتی ہے کیا پراپیگنڈا والے جہاد سے افتراق کو ختم کیا جاسکتا ہے؟ کیا تبلیغ کا منظم انداز دوسروں کو منفی طور پر لٹ نہیں کر دیتا؟ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ تینوں گروہ ”اجتہادی روح“ سے عاری ہیں (اجتہادی نظر کا نہ ہونا ہی سب سے بڑی بدعت ہے) اسی لیے تینوں ایک دوسرے سے بیگانہ، بے چلک انداز میں کام کر رہے ہیں۔ اجتہادی نظریہ واحد نقطہ اشتراک ہے۔ اگر کوئی جہادی ہے اور اس کے ساتھ اجتہادی ہے، اگر کوئی فقہی ہے اور اس کے ساتھ اجتہادی ہے، اسی طرح اگر کوئی تبلیغی ہے اور اس کے ساتھ اجتہادی ہے (خیال رہے کہ اجتہادی نظر، تصور خاتمیت کے سبب ہے) تو اس سے نہ صرف آپس میں ربط بڑھے گا بلکہ ان کے اپنے اپنے مخصوص شعبے میں بھی تازگی ہمہ دم موجود رہے گی۔ اسی ربط اور تازگی سے دین کی پوری تصویر سامنے آئے گی اور وحدت انسانیت کی طرف پیش قدمی ممکن ہو سکے گی۔

وحدت انسانیت کے حوالے سے ہی ایک بات یہ ہے کہ موجودہ وقت میں ایک طرف گلوبلائزیشن کا شور و غوغا ہے تو دوسری طرف علاقائی ثقافتیں ابھر رہی ہیں، جس سے عالمی فضا غیر یقینی سی ہو گئی ہے۔ راقم کے نزدیک گلوبلائزیشن اور علاقائی ثقافتوں کا احیا، دو متضاد رجحانات نہیں ہیں۔ ذرا غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ علاقائی ثقافتیں ”لوک ورثے“ کا احیا چاہتی ہیں۔ لوک ورثے کے احیا سے گلوبلائزیشن کے ظاہری عمل کو ”روح“ مل جائے گی۔ کیونکہ روح انسانی فطرت ہے، آرٹ کے ذریعے روح انسانی کا اظہار ہوتا ہے اور دنیا کا بہترین آرٹ ”لوک سطح“ پر ملتا ہے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ ”لوک سطح“ پر انسانی فطرت خارجی علم اور خارجی عناصر سے مکمل حد تک بچی رہتی ہے اور خالصتاً داخل کا، باطن کا اظہار کرتی ہے۔ اس لیے ہمیں دنیا کی تمام ثقافتوں کا لوک ورثہ ”ملتا جلتا“ دکھائی دے گا کیونکہ روح انسانی ایک ہے۔ اس طرح لوک ورثے کی جانب رجوع، وحدت کا سفر ہے۔ یہ بہت خوش آئند بات ہے کہ تاریخ کے اس موڑ پر جب خارجی جبر (تمدنی سطح پر) گلوبلائزیشن لا رہا ہے، انسان کا داخل بھی (ثقافتی سطح پر)

وحدت سے از سر نو آشنائی پیدا کر رہا ہے۔ جہاں تک لوک سطح پر افتراق کا تعلق ہے، وہ بہت جزوی ہے۔ ایسا فرق کچھ ایسے ہی ہے جیسے سورج کی روشنی کو منشور سے گزریں تو وہ سات رنگوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ روح انسانی بھی جب ”ارضی منشور“ سے گزرتی ہے تو (شاید سات) رنگوں میں منقسم ہو جاتی ہے، حالانکہ اس کی اصل سورج کی روشنی (سفیدی) کی مانند ایک ہے۔ قرآن مجید میں (سورۃ الحجرات، آیت ۱۳) اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ”لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، پھر تمہارے کنبے اور قبیلے بنا دیے، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے، جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے، اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے“ (۷) راقم الحروف کے مطابق رنگارنگی کا یہ فرق ”اندیشوں“ میں اس وقت ڈھلتا ہے جب کوئی رنگ یا ہر رنگ ”اصل“ سے دور پٹتے ہوئے اپنے رنگ کو ہی ”اصل“ سمجھ بیٹھتا ہے۔ پھر اندیشوں کی ایسی سرزمین میں قوم پرستی، نسل پرستی اور زبان پرستی وغیرہ کی ”باڑیں“ لگنی شروع ہو جاتی ہیں۔ اگر نوع انسانی اس ”تعارفی رنگارنگی“ کو قائم رکھتے ہوئے بھی، اپنی اصل کے ساتھ ”واہنگی“ سے محترز نہ ہو تو تصادم کی بجائے موافقت و اخوت پر وان چڑھے گی اور وحدت انسانیت کا ازلی خواب پورا ہوگا۔ راقم کے نزدیک تبلیغی جماعت ان مختلف ثقافتی منطوق کو ”اصل“ سے متعارف کر رہی ہے۔ یہ عظیم خدمت ہے۔ اگر تبلیغی جماعت، دین اسلام کے امتیازی وصف ”تصورِ خاتمیت“ کی روح، یعنی اجتہادی نظر کو اپنے احوال میں سمو لے، تو تبلیغ کے جامد اور لگے بندھے طریقے، رونما ہونے والی ممکنہ تبدیلی کی راہ نہیں روک سکیں گے۔ رسول کریم ﷺ کا ارشادِ پاک ہے ”من استسوی یو ماہ فہو مغبون“، کہ جس شخص کے دودن یکساں ہوں، یعنی جس نے کل کے مقابلے میں آج کوئی ترقی نہیں کی وہ شخص گھٹا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ”کل یوم ہو فی شان“ بھی یکسانیت کو رد کرتا ہے کہ یک رنگی زندگی کی سرشت میں ہی نہیں، لہذا ہمارے مبلغ کو ”آرٹ“ کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

سورۃ الحجرات کی اس آیت مبارکہ سے ایک اور نکتہ سامنے آتا ہے کہ زندگی کا حسن اور رعنائی ”سادگی“ میں ہے۔ جیسے سورج کی روشنی سفید ہونے کے باعث، سادہ ہوتی ہے لیکن اس میں حسن اس اعتبار سے عروج پر ہوتا ہے کہ اس میں ”ساتوں رنگ“ گھلے ملے ہوتے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوگا کہ (منشور سے گزر کر) ہر رنگ ”سفیدی“ سے زیادہ خوش نما ہے، لیکن اہل نظر کو سفیدی میں ہی ایک کے بجائے ساتوں رنگ اکٹھے دکھائی دیں گے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ حسن، سادگی میں ہے۔ راقم کی رائے میں اگر انسان حسن پسند بن جائے تو وہ لازماً حقیقی حسن کو ظاہری رنگارنگی کی بجائے اس وحدت میں دیکھے گا جہاں تمام رنگ بغل گیر ہوتے ہیں۔ ایسی حسن پسندی کبھی بھی انسانوں کے مابین اس حد تک تفریق نہیں ہونے دے گی کہ کراہت زندگی کا لازمہ بن جائے۔ سوال یہی ہے کہ کیا فقہ، حسن پسندی کو فروغ دے سکتی ہے؟ راقم کے نزدیک یہ منصب آرٹ کا ہی ہے۔ کیا ہمارے آرٹ کی موجودہ سطح، ایسی رمزیت کی حامل ہے کہ ہم اس سے ایسی امیدیں باندھ سکیں؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ لہذا اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ آرٹ کو اس کا

مقام دیتے ہوئے، دین اسلام کے عالمگیر تصورات کو، جو وحدت انسانیت اور تکریم انسانیت کے گرد گھومتے ہیں، اجاگر کیا جائے۔

حواشی

- (۱) خیال رہے کہ یہاں فقہ بمعنی قانون مراد ہے۔
- (۲) اگرچہ علوم کے ایک شعبہ پر دسترس کے باعث انہیں عالم کہا جاسکتا ہے، لیکن اس حوالے سے انہیں عالم قرار نہیں دیا جاسکتا، جس حوالے سے وہ خود کو عالم سمجھتے ہیں، یا معاشرہ میں انہیں سمجھا جاتا ہے۔
- (۳) خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ نے قحط کے زمانے میں چوری کی سزا (ہاتھ کاٹنے کو) ساقط قرار دیا تھا۔ ان کے ہاں یہ اپروچ، تصور خاتمیت سے پھوٹنے والی اجتہادی نظر کا نتیجہ ہے۔
- (۴) جھوٹ ہمارے معاشرے کے رگ و پے میں جس قدر سرایت کر چکا ہے اس سے بات بہت بڑھ گئی ہے۔ برصغیر میں انگریز راج کے دوران لارڈ کرزن (وائسرائے ہند) نے کہا تھا کہ ہندوستانی بہت جھوٹے ہوتے ہیں۔ اس پر ایک انگریز ادیب نے کہا تھا کہ ہندوستانی غیر معمولی طور پر جھوٹے ہوں گے کہ کرزن جیسے سیاستدان کا دم بھی وہاں گھٹنے لگا، حالانکہ پارٹی پالیٹکس کا دارو مدار ہی جھوٹ پر ہے۔

اسی طرح جھوٹ کی عوامی سطح پر پزیرائی بھانپتے ہوئے لارڈ میکالے نے کہا تھا کہ ”حضور اس ملک میں بہت بڑی لعنت وہ شخص ہیں جو جھوٹی قسم کھاتے ہیں۔ حج جھوٹ اور بیچ میں امتیاز نہیں کر سکتا۔ اگر حضور لوگوں کو سچی قسم کھانے کی عادت ڈال دیں تو آپ کی شہرت کو چار چاند لگ جائیں گے اور کمپنی کو بے حد فائدہ ہوگا۔ اگر آپ جھوٹی قسم کھانے والے کا ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر فرمائیں تو حضور آپ کی شہرت کو پر لگ جائیں گے“۔ راقم کی نظر میں سچی قسم کھانے کی عادت ڈالنا اور جھوٹی قسم کھانے سے روکنا ”قانون“ کے بس میں نہیں ہے۔

حیرت کی بات تو ہے کہ جھوٹ اس وقت پہلے سے بھی زیادہ ”کرد فر اور شان“ سے ہماری روزمرہ زندگی کا لازمہ بن چکا ہے۔ جھوٹ کو فرد کے نفس سے نکالنے کا ”اظہار“ تاریخ اسلام کے اس واقعہ سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ جب نجاشی کے دربار میں جب حضرت جعفر شریف لے گئے تو پہلے دن کی پسپائی کے بعد عمرو بن العاص (جو کفار مکہ کی نمائندگی کر رہے تھے) نے دوسرے دن پھر دربار میں رسائی حاصل کی اور نجاشی اور درباریوں کو مشتعل کرنے کی خاطر بادشاہ سے عرض کی کہ حضرت عیسیٰ سے متعلق مسلمانوں کا عقیدہ معلوم کیجیے، پھر فیصلہ دیجیے۔ نجاشی نے مسلمانوں سے یہ دریافت کیا تو مسلم وفد کو یہ فکرمند امن گیر ہوئی کہ اگر عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے کا اقرار کرتے ہیں تو ایمان ہاتھ سے جاتا ہے، تاہم صحابہؓ نے حالات کی سنگینی کی پروا نہ کرتے ہوئے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ ”واللہ ہم وہی کہیں گے جو اللہ کا حکم ہے اور جو ہمارے نبی کی تعلیم ہے چاہے کچھ ہو جائے“۔

یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ مسلم وفد میں ایسی کون سی چیز تھی جس نے حالات کی انتہائی سنگینی کے باوجود (کہ اسلام کا ابتدائی عہد تھا کفار مکہ نے جینا دو بھر کر دیا تھا، اسی لیے مسلمانوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی کہ کچھ دوست مل سکیں) انہیں جھوٹ بولنے سے

باز رکھا۔ یہ سوال بہت اہم ہے۔ ہمارا فقیہ تو یہ کہہ کر اپنے فرض سے ”فارغ“ ہو جائے گا کہ وہ صحابہ کرامؓ کی جماعت تھی ان کا ایمان ہی اتنا مضبوط تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول سکتے تھے۔ یہ جواب صحیح ہونے کے باوجود ”سطحی“ ہے۔ بھئی ایمان آخر اتنا مضبوط کیسے ہو گیا؟ یہ تو تفقہ فی الدین سے جان چھڑانے والی بات ہے۔ راقم کی نظر میں مسلم وفد کا سچا جواب اس وجہ سے تھا کہ رسالت مآب ﷺ نے دعوت دین دیتے وقت ہمیشہ مخاطب کے ”شعور“ کو اڈریں کیا نہ کہ جذبات کو۔ کسی انسان میں جذباتی سطح تک سمائی ہوئی فکر، حالات سے دب کر کوئی اور رخ لے سکتی ہے، لیکن شعور میں سمائی ہوئی فکر، حالات کو اپنے رخ پر لے جاتی ہے۔ لہذا یہ رسول کریم ﷺ کا مخصوص انداز دعوت تھا جس کے سبب صحابہؓ آسمان کے ستارے بن گئے۔ اس لیے شعور میں ”صدق“ راسخ ہونے سے صحابہؓ جھوٹ نہ بول سکے۔ ہجرت حبشہ کے حوالے سے ہی ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ”اگر تم سرزمین حبشہ کو نکل جاؤ تو بہتر ہے کہ وہاں کے بادشاہ کے ہاں کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا اور وہ سرزمین صدق ہے“۔ اس طرح روانگی سے قبل بھی سرزمین حبشہ کے چناؤ کی ”وجہ“ صحابہؓ کے شعور میں ڈال دی کہ وہ سرزمین صدق ہے۔

(۵) آرٹ کے مترادف مختلف الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں، مثلاً ہنر، زخرف، صناعت اور فن وغیرہ۔ راقم کی رائے میں قرآن مجید میں ”حکمت“ اور اسی نوع کے دیگر الفاظ، آرٹ کی خصوصیات اور صفات کو محیط ہیں۔

(۶) دیکھئے حاشیہ نمبر ۴۔

(۷) اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی الگ پہچان، اس کے تشخص اور انفرادیت کے لیے ”شعوباً و قبائل“ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ آج کی اصطلاح میں یہ دونوں الفاظ قوم کی بجائے ”قومیت“ کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ قومیت، الگ تشخص کی وہ سطح ہے، جہاں سے دوسری قومیت بھی ”انسان“ دکھائی دیتی ہے۔ جبکہ ایک قوم دوسری قوم کو انسان کا سٹیٹس دینے کو ”عملاً“ تیار ہی نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر پاکستان کی چار قومیتیں ہیں اور قوم ایک ہے۔ وفاقی نظام کی وجہ سے چاروں قومیتوں کی ”شناخت“ قائم ہے۔ جب ان میں سے کوئی ایک یا سبھی قومیتیں ”قوم“ بننے کے لیے پرتولیں تو پھر وہ اپنے الگ تشخص کے لیے اس سطح پر جا پہنچتی ہیں، جہاں کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ یہ صورت حال بین الاقوامی سطح پر بہت واضح ہے کہ ہر قوم فقط اپنے آپ ہی کو ”انسان“ سمجھتی ہے۔ اس وقت امریکی اسی سوچ کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ قرآن مجید کی اس آیت مبارکہ کی روشنی میں ذرا غور کیجیے کہ اگر عالمی سطح پر بھی ”شناخت“ کو قوم کی بجائے قومیت کی حد تک رکھا جائے تو انسانوں کے مابین تفریق ”تعارف“ کی سطح تک رہے گی اور مشترکہ انسانی حوالہ ہمیشہ پیش نظر رہے گا۔ سول یہ ہے کہ اسلام کے اس آفاقی پیغام کو تمام عالم انسانیت تک پہنچانے کی سکت، کیا ہمارا نام نہاد دینی طبقہ رکھتا ہے؟ تکلف برطرف! کیا دینی طبقے کے اندر، اس پیغام کی معنویت کی تفہیم بھی ہے کہ نہیں؟